خوشتر گرامی سے ملیے!



وہ بسترِ علالت پر ہیں اور اپنی زندگی کے ایک ایک سانس اذیت ناک لمحوں کے حوالے کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے سامنے اردو کا نام آجائے تو چہرے پر اچانک ایک تازگی سی آجاتی ہے۔ لمحوں کی اذیت کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ لفظِ اردو آج بھی ان کے لئے اسمِ اعظم کا حکم رکھتا ہے۔ وہ بھول گئے ہیں کہ کسی زمانے میں وہ "بیسویں صدی" جیسے رسالے کے مالک و مدیر تھے۔ اور ان کا نام خوشتر گرامی تھا۔ اب وہ کہتے ہیں کہ: "میرا نام اردو ہے"

شرکاء: ○ عثمان منیار ○ عبداللہ کمال

"بیسویں صدی" اردو کا وہ رسالہ ہے، جس نے اردو ادیبوں کی پانچ نسلیں تیار کی ہیں اور اردو ریڈر شپ کو ہندستان ہی نہیں، پاکستان ہی نہیں، دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دیا ہے۔

یہ رسالہ مولانا عبدالمجید سالک اور یزدانی جالندھری جیسے علمائے ادب کے تعاون سے نکالا گیا تھا۔ لاہور کی مردم خیز سرزمین اس کا مولد تھی۔ زمانہ ۱۹۳۵ء کے آس پاس کا تھا اور اس کے بانی، مالک اور اڈیٹر کا نام تھا۔ خوشتر گرامی!

خوشتر صاحب کی عمر اس وقت تقریباً ۸۲ سال ہے۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی اور شیرِ پنجاب لالا لاجپت رائے اور مولانا ظفر علی خان کے ساتھ تحریکِ آزادی میں شامل ہو گئے۔ اس سلسلے میں گرفتار بھی ہوئے۔ اور جیل بھی گئے۔ اس طرح ان کی ایک حیثیت فریڈم فائٹر کی بھی ہے۔

"بیسویں صدی" نکالنے سے قبل ایک عرصے تک انھوں نے لالہ جی کے اخبار "بندے ماترم" مولانا ظفر علی خان کے "زمیندار" اور لاہور ہی کے ایک اور روزنامہ "درپن" میں بھی کام کیا۔ "بندے ماترم" میں وہ زیادہ تر اڈیٹوریل نوٹس لکھا کرتے تھے، جو لالہ جی کے خیالات پر مبنی ہوتے تھے۔

انھوں نے طلبار کے لیئے اردو کورس بھی لکھے، جو غیر منقسم پنجاب، یوپی، سی پی اور فرنٹیئر کے بیشتر اسکولوں کے نصاب میں پڑھائے جاتے رہے۔

خوشتر صاحب "بیسویں صدی" سے پورے پچاس سال تک وابستہ رہے۔ اس کے مزاج، مذاق اور معیار کو ادب کی ایک مخصوص سطح پر قائم رکھا۔ گذشتہ پچاس سال تک خوشتر گرامی اور "بیسویں صدی" آپس میں اس طرح خلط ملط ہو گئے کہ دونوں ایک دوسرے کا مفہوم بن گئے۔ یعنی خوشتر گرامی "بیسویں صدی" کی تفہیم سمجھے جانے لگے۔ اور "بیسویں صدی" خوشتر گرامی کی تعبیر۔

اس کے بعد اس سنہرے دور کا اختتام یا ایک دردناک موڑ آیا۔ عاشق خوشتر گرامی معشوق "بیسویں صدی" سے دودھ کی مکھی کی طرح جدا کر دیے گئے۔ پوری اردو دنیا حیران رہ گئی کہ یہ کیا ہو گیا؟ جو بات خارج از امکان تھی وہ ممکن کیسے ہو گئی؟ اس سلسلے میں کچھ اڑتی پھرتی خبریں آئیں کہ خوشتر گرامی کافی مقروض ہو گئے تھے۔ اور "بیسویں صدی" کا دیوالہ نکل گیا تھا۔ اس لیے ماہنامہ روبی کے مالک مسٹر رحمٰن نیر نے اس کا گڈ وِل خوشتر صاحب سے خرید لیا۔



صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ خوشتر صاحب کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے پیچھے بیگم خوشتر اور مسٹر سیٹھی والے نظر آ رہے ہیں۔

چنانچہ "بیسویں صدی" مسٹر رحمٰن نیر کی نگرانی میں چلنے لگا۔ اس کا پچاس سالہ مزاج، مذاق اور معیار بدل گیا۔

خوشتر صاحب سے ہمارا پرانا تعلقِ خاطر تھا۔ دلی جانا ہوتا تھا تو اکثر ان کی عنایتوں اور ضیافتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی ملا کرتا تھا۔

"بیسویں صدی" کے اس انتقالِ ناگہانی سے دل میں ایک کھٹک سی تھی۔ سوچا کرتے تھے کہ اب کبھی دلی جانا ہوا اور خوشتر صاحب سے ملاقات ہوئی تو اس سلسلے میں تفصیلی گفت گو کریں گے۔

اتفاق سے گذشتہ دنوں جنوری میں "گل منظر" کے ڈکلریشن کے سلسلے میں دلی جانے کا موقع ملا۔ ایک شام حسبِ روایت موہن سنگھ پلیس کے کافی ہاؤس میں یاروں سے ملاقات ہوئی۔ بیشتر علمی ادبی موضوعات زیرِ گفت گو آئے۔ ایک موقع پر خوشتر صاحب کا ذکر بھی نکل آیا۔ بعض حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ ان میں سے ایک انکشاف (ہمارے لیے) یہ بھی تھا کہ خوشتر صاحب گذشتہ چھ سال سے بمبئی میں مقیم ہیں؟ بمبئی میں کہاں؟ اس کا پتہ اس محفل میں کسی کو نہیں تھا۔

کسی زبان کا اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ ایک شخص پچاس سال تک دل و جان سے جس زبان کی خدمت کرتا رہا، وہ غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی اچانک اس کے لیے اجنبی ہوگیا ــــ خوشتر صاحب چھ سال سے بمبئی میں تھے اور اردو والوں کو اس کی خبر تک نہ تھی!

بمبئی میں خوشتر صاحب کی جائے قیام معلوم کرنے کے لیے کئی ذرائع استعمال کیے۔ آخر شیام کشن نگم صاحب ہی ایک کارآمد ذریعہ ثابت ہوئے۔ پتہ چلا خوشتر صاحب چیمبور میں اپنی لڑکی مسز بڑولا کے گھر صاحبِ فراش ہیں۔

نگم صاحب سے حاصل کردہ فون نمبر پر جب خوشتر صاحب سے رجوع کیا تو وہ ہماری آواز سنتے ہی رو پڑے۔ کافی دیر بعد جب وہ بات کرنے کے قابل ہوئے تو اس سے پہلے کہ ہم ان سے ملنے کا وقت مانگتے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ ہم شام کو ان کے گھر آجائیں۔

شام کو جب ہم گھر پہنچے تو ایک بار پھر خوشتر صاحب کے آنسوؤں نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ بڑے جذباتی ہو رہے تھے۔ انھوں نے بڑے درد بھرے انداز میں شکایت کی کہ گذشتہ تین سال سے وہ برین ہیمریج کے مریض ہیں، مگر یہاں کوئی ان سے ملنے نہیں آتا۔

طویل علالت کے سبب وہ اتنے کمزور نظر آ رہے تھے کہ ان سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا ان کی بیوی اور بیٹی ان کے کمرے سے سہارا دے کر بڑی مشکل سے نشست گاہ تک لائی تھیں۔ انھوں نے ہمارے ٹیپ ریکارڈر کی طرف حیرت سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ــــ ہم نے بتایا کہ یہ ٹیپ ریکارڈر ہے۔ ہم اس ملاقات کو یادگار بنانا چاہتے ہیں۔

وہ اچانک روتے روتے کسی بچے کی طرح معصومیت سے مسکرا پڑے۔ اور انکسار سے بولے ــــ

"یہ آپ کی عزت افزائی ہے کہ مجھ جیسے ازکار رفتہ شخص کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔ میں تو اب چراغِ سحری ہوں۔ کسی بھی لمحے بجھ سکتا ہوں برین ہیمریج ایک بیماری ہے کہ جس میں آدمی بچتا نہیں ہے۔"

خوشتر صاحب نے ڈیڑھ دو گھنٹے تک ہم سے گفتگو کی۔ یہ گفت گو بالترتیب نہیں تھی۔ مربوط بھی نہیں تھی۔ "بیسویں صدی" سے وہ دست بردار ہو گئے تھے۔ مگر ذہنی طور پر شاید علاحدہ نہیں ہوئے تھے۔ اس سانحے پر دل اور دماغ دونوں بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ ہم کوشش کریں گے کہ یہ گفتگو کسی حد تک مربوط شکل میں آپ کے سامنے آئے۔

انھوں نے علاج معالجے کے سلسلے میں بتلاتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر نے تو ہفتے میں کم از کم ایک بار چیکنگ کرانے کی تاکید کی تھی، لیکن وہ مہینے میں صرف ایک بار جاتے ہیں۔ ہمیں اس پر تشویش بھی ہوئی اور حیرت بھی بھلا اس صورت میں، جب کہ وہ چلنے پھرنے سے قطعی معذور ہیں، ڈاکٹر کے یہاں کیسے جاتے ہوں گے ــــ؟ یہ سوال ہماری زبان پر آگیا۔ اور اس کا جواب سن کر ہم اندر ہی اندر دور تک کٹتے چلے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر اگر ہمارے گھر وزٹ کرتا ہے تو ڈھائی سو روپے فیس لیتا ہے۔ اور ہم اس کے گھر جاتے ہیں تو صرف ایک سو پچاس روپے میں کام چل جاتا ہے۔ تھوڑی سی تکلیف برداشت کر لو تو پورے سو روپے بچ جاتے ہیں۔

یہ جواب کسی بھی اہلِ دل کو تڑپا دینے کے لیے کافی تھا۔ یہ جواب ایک ایسے شخص کا تھا کہ کل تک جس کی ایک چھینک پر دس ڈاکٹر دوڑے چلے آتے تھے۔ آج وہ سو روپے بچانے کی خاطر اس معذوری کی حالت میں بھی ڈاکٹر کے یہاں جانے پر مجبور تھا۔ صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ خوشتر صاحب کے دوستوں میں ہیں وہ جب ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے تھے۔ تو نہ صرف سرکاری مالی امداد کا وعدہ کیا تھا بلکہ ان کی خدمات کے اعتراف میں پدم بھوشن کے اعزاز کی بھی سفارش کی تھی ــــ مگر افسوس، یہ وعدے سرکاری تھے ــ؟

اسی طرح مہاراشٹر اردو اکادمی کے مرحوم سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور نے ان کے علاج و معالجہ کے لیے

ایک معقول رقم مختص کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر وہ وعدہ وعدۂ محبوب ثابت ہوا۔ ؟

خوشتر صاحب اس حالتِ تباہ کے باوجود شاکر و صابر تھے۔ اس تباہی و بربادی کے لیے وہ خود اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دے رہے تھے۔ بہت اصرار سے پوچھنے پر انھوں نے روتے بلکتے ہوئے بتایا کہ ان کے ساتھ جو بھی ڈراما کھیلا گیا۔ اس میں ان کے منیجر مودود احمد نے بہت گھناؤنا رول انجام دیا۔ انھوں نے بتایا۔

"یہ مودود احمد وہ ہے، جسے میں نے بچپن سے اولاد کی طرح پالا۔ جوان ہوا تو اس کی شادی کی۔ میں خود برات لے کر امروہہ گیا تھا۔ اور اس کی دلہن کو رخصت کرا کے لایا تھا — لیکن افسوس، اسی نے میری پشت میں خنجر اتار دیا۔"

ہمیں اس انکشاف پر تھوڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ مودود صاحب سے کسی حد تک ہم بھی واقف تھے، اس لیے ہم نے خوشتر صاحب سے پوچھا کہ آخر مودود احمد کو ایسی حرکت کرنے کی کیا ضرورت تھی — کیونکہ وہ ایک محنتی اور ایماندار آدمی تھے۔ "بیسویں صدی" کا مکمل انتظام سنبھال رکھا تھا۔ اس کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔

خوشتر صاحب نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔

"یہی تو افسوس کی بات ہے کہ وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس نے سفید سب اپنے لیے کیا۔ سیاہی میرے منہ پر مل دی — میں اس پر بیٹے سے زیادہ بھروسا کرتا تھا۔ بلینک چیک پر دستخط کر دیتا تھا۔ اس نے یہ چالبازی کی کہ آہستہ آہستہ میرا سارا اکاؤنٹ خالی کر دیا۔ اس سازش میں کاغذی بھی اس کے ساتھ تھا۔ اور ایک شخص اور بھی . . . "

"کون تھا وہ شخص —؟" ہم نے پوچھا۔

"نہیں — میں اس شخص کا نام نہیں بتا سکتا۔ میں اسے بچے کی طرح سمجھتا ہوں۔ اس سے وعدہ کر چکا ہوں کہ کبھی اسے ایکسپوز نہیں کروں گا۔"

وہ اس تباہ حالی میں بھی اپنی اعلاظرفی نبھا رہے تھے۔

ہم نے اصرار کیا کہ وہ تو مودود احمد کو بھی اپنا بچہ سمجھتے تھے اور بقول ان کے مودود احمد نے انھیں تباہ و برباد کرنے کی سازش کی۔

"کچھ بھی ہو جی۔ میں اس شخص کا نام نہیں لے سکتا۔"

وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔

"کیا وہ شخص کسی معاملے میں آپ کو بلیک میل کر رہا ہے؟" ہم نے ایک خدشہ ظاہر کیا۔

"نہیں جی نہیں — اب میرے پاس بچا ہی کیا ہے کہ کوئی بلیک میل کرے گا۔" انھوں نے جلدی سے تردید کی۔

ہم نے پوچھا۔

"آپ نے مودود احمد کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی؟"

"کی تھی۔ اسے پولیس نے پکڑ بھی لیا تھا۔ مجھے اس کے بچوں پر رحم آ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ معافی مانگ لے کہ آیندہ ایسی غلطی نہیں کرے گا تو چھوڑ دوں گا۔ اس نے معافی مانگ لی۔ میں نے چھوڑ دیا۔"

انھوں نے بڑی معصومیت سے یہ بات کہی اور ہم ہنس پڑے۔

اسی دوران بیگم خوشتر چائے کے لوازمات وغیرہ لے کر آ گئیں۔ خوشتر صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ انھوں نے قدم قدم پر ساتھ دیا ہے ان کا۔ اتنی خدمت کی ہے کہ لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ وہ یہ کہتے کہتے پھر رو پڑے۔ ہم نے انھیں چپ کراتے ہوئے کہا کہ ایک بیوی کی حیثیت سے انھوں نے ان کے لیے جو کچھ کیا۔ وہ ان کا فرض تھا۔ دھرم تھا۔ آپ نے بھی تو اردو کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ کیا آپ کی خدمات لفظوں میں بیان ہو سکتی ہیں۔؟ وہ روتے روتے اچانک پرجوش آواز میں بولے — "میں نے اردو کے لیے جو کچھ کیا، وہ میرا فرض تھا۔ میرا دھرم تھا۔ اردو آج بھی میری زندگی ہے۔ میرا ایمان ہے۔ میں اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"پھر آپ نے اپنی جان سے عزیز "بیسویں صدی" کو فروخت کیوں کر دیا؟" ہم نے اچانک یہ سوال داغ دیا۔

اور وہ جیسے اچانک ٹوٹتے بکھرتے چلے گئے۔ اور بڑی نحیف آواز میں بولے۔

"ہاں — میں نے اپنی اولاد کو، اپنے لختِ جگر کو



عثمان منیار اور عبداللہ کمال خوشتر صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے۔

قارون کا خزانہ

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کا ایک بہت مالدار، مغرور اور کنجوس شخص گزرا ہے۔ اس کا خزانہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کئی طاقتور آدمیوں کی جماعت بمشکل اس خزانے کی کنجیاں اٹھا سکتی تھی۔ ایک دن وہ شہر میں پوری شان و شوکت سے نکلا۔ جس کو دیکھ کر لوگ اس کی حالت پر رشک کرنے لگے لیکن جو سمجھدار تھے، انہوں نے کہا کہ چند روزہ ثروت ہے، چنانچہ چند ہی روز کے بعد وہ اہل خاندان اور زر و دولت سمیت زمین میں دھنس گیا۔

بیچ دیا۔ میں اس کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔ مجھے مجبور کر دیا گیا تھا۔۔۔ کیا کرتا۔ میری پچاس سال کی محنت سے بنائی ہوئی عزت داؤں پہ لگ گئی تھی۔ رحمٰن نیر نے اسے خرید لیا۔ ساٹھ ہزار میں۔ ایک ہزار روپے مہینہ میرا نام استعمال کرنے کا معاوضہ الگ تھا۔ وہ بھی اپنا بچہ ہی ہے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گا۔ مگر بہت تبدیل کر دیا۔ میں نے کبھی فلم، سگریٹ اور شراب کے اشتہار اس میں نہیں چھاپے۔ اب اس میں سب کچھ چھپتا ہے۔ اب تو وہ میرا 'بیسویں صدی' لگتا ہی نہیں۔ نہ میرے پاس اس کا کوئی پرچہ اب آتا ہے۔"

"وہ ساٹھ ہزار روپے کیا ہوئے؟ کیا سب علاج میں خرچ ہو گئے؟" ہم نے حیرت سے پوچھا۔

قبل اس کے کہ خوشتر صاحب کوئی جواب دیتے ان کی لڑکی بول پڑی۔

"ملے ہی نہیں۔"

"نہیں جناب۔ سب مل گئے" خوشتر صاحب جلدی سے بولے۔

"اور وہ ایک ہزار روپے مہینہ کی رقم۔؟" ہم نے پوچھا۔

"وہ بھی اب نہیں ملتی۔۔۔ صرف شروع میں ایک دو ماہ تک ملی تھی۔"

اس دفعہ بیگم خوشتر نے مداخلت کی۔ خوشتر صاحب اس بار کچھ بولے نہیں۔ صرف کسمسا کر رہ گئے۔

ہمارے ذہن میں شروع ہی سے ایک بات کھٹک رہی تھی۔۔۔ "بیسویں صدی" جیسے کامیاب رسالے کے مالک ہونے کی حیثیت سے دلی کے مارکٹ میں خوشتر صاحب کی ساکھ کافی مضبوط ہونی چاہیے تھی۔ وہ چاہتے تو لاکھوں روپے کا ادھار ان کے ایک اشارے پر مل سکتا تھا۔ پھر انھوں نے "بیسویں صدی" جیسے سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو اس طرح اونے پونے کیوں فروخت کر دیا۔۔۔؟ آخر وہ کون سی مجبوری تھی۔۔۔؟ ہم نے بار بار گھما پھرا کر یہ سوال کیا، لیکن انھوں نے ہر بار بات بدل دی۔ آخر میں بڑی مشکل سے انھوں نے صرف اتنا کہا:

تمام عمر عذابوں کا سلسلہ تو رہا
یہ کم نہیں، ہمیں جینے کا حوصلہ تو رہا
گذر ہی آئے کسی طرح تیرے دیوانے
قدم قدم پہ کوئی سخت مرحلہ تو رہا

"رحمٰن نیر میرے بچے کے برابر ہے۔ میں اس کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔ میں نے وعدہ کیا ہے۔"

یہ ظرف تھا اس شخص کا، جو بالکل لٹ چکا تھا۔ تباہ ہو چکا تھا، لیکن اپنے کردار کی مضبوطی پہ قائم تھا۔

آخر میں ہم نے ایک دلچسپ سوال پوچھا۔۔۔

"خوشتر صاحب، آپ کا اصل نام کیا ہے؟"

اور وہ بھڑک گئے۔

"اصل نام۔۔۔ میرا اصل نام اردو ہے۔ مجھے آپ اردو میرا نام ہے۔"